بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

معیشت کی زبوں حالی' اربابِ دولت کی فراوانی

خورشید احمد

ہفت روزہ ایکونومسٹ' لندن میں کچھ عرصہ پہلے ایک تجزیہ نگار نے پاکستانی معیشت کے مخمصے اور تضاد کو ایک جملے میں یوں ادا کیا تھا: "وہ ایک غریب ملک ہے جس میں دولت مندوں کی فراوانی ہے"۔ آزادی کے پچاس سال بعد وہ ملک جس کی زمین کی زرخیزی ضرب المثل تھی' جس کے پاس وافر قدرتی اور انسانی وسائل موجود تھے اور جس کے لیے ایک موثر علاقائی طاقت کی حیثیت سے ابھرنے کے سارے امکانات موجود تھے آج ۲۰ کھرب روپے سے زیادہ کا مقروض ہے' جس کا نصف تقریباً ۳۳ بلین ڈالر بیرونی قرض کی صورت میں ہے اور جسے آج صرف حالیہ قرضوں کا سود ادا کرنے کے لیے بنکوں اور مالی منڈی کے مہاجنی شرح پر قلیل مدت قرضے حاصل کرنا پڑے ہیں' اور اس سال صرف ان ادایگیوں کے لیے ۴ ارب ڈالر سے زیادہ درکار ہیں (واضح رہے کہ دو سال پہلے تک یہ رقم ۲ ارب ڈالر تھی)۔ اگر ملک کے بجٹ پر سود کے اس بار کا آپ اندازہ کرنا چاہیں تو صرف اتنا جان لیں کہ موجودہ مالی سال میں وفاقی حکومت نے محصولات کی وصولی کا ہدف ۳۲۴ ارب روپے رکھا ہے جس میں سے صرف سود اور فوری قرضے ادا کرنے کے لیے ۲۴۸ ارب روپے درکار ہوں گے۔ دفاع کا بجٹ' سود اور قرضوں کی ادایگی کی رقم کا صرف ۶۰ فی صد ہے یعنی ۱۳۴ ارب روپے۔ محصولات کی پوری آمدنی سے سود کی ادایگی کے بعد صرف ۷۶ ارب روپے بچتے ہیں جو دفاع کے بجٹ کے لیے بھی کافی نہیں۔ انتظامی اخراجات' تعلیم' صحت اور فلاحی خدمات کے لیے رقم اور پھر ترقیاتی منصوبوں کے لیے وسائل' سب مزید قرض کے محتاج ہوں گے۔ جو "کشکول گدائی" توڑنے کا مینڈیٹ لے کر آئے تھے اور "قرض اتارو' ملک سنوارو" کے خوش کن نعروں سے دور نو کے آغاز کی نوید سنا رہے تھے وہ صرف ۹ ماہ میں ڈیڑھ دو سو ارب روپے کے قرضوں کا نیا بار اس قوم کے کمزور و نحیف کاندھوں پر ڈال چکے ہیں اور تباہی کی اسی راہ پر بگٹٹ دوڑ رہے ہیں۔ آئی ایم ایف' ورلڈ بنک' ایشیائی ترقیاتی

بنک سے آگے بڑھ کر اب تو مارکیٹ سے مستقبل کی برآمدات، ٹیلی کمیونی کیشن کے حصص کی فروخت اور بیرون ملک پاکستانیوں کی متوقع ترسیلات (remittances) گروی رکھ کر اونچی شرح سود پر فوری اور قلیل مدت قرضے حاصل کیے جا رہے ہیں تاکہ ملک کو دیوالیہ (default) ہونے سے بچایا جا سکے۔ قلیل مدت قرضے جو ۹۳-۱۹۹۲ میں کل بیرونی قرضوں کا ۱۳ فی صد تھے اب (۹۸-۱۹۹۷) بڑھ کر ۲۰ فی صد سے زائد ہو گئے ہیں اور صرف ان قلیل مدت قرضوں کا سود اور ادائیگی ۲.۷ بلین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ صرف بیرونی قرض کل ملکی پیداوار (GDP) کا ۴۸ فی صد (اندرونی قرض کل ملکی پیداوار کا مزید ۴۱ فی صد ہے یعنی کل قرض، ملکی پیداوار کا تقریباً ۹۰ فی صد ہو گیا ہے) اور بیرونی قرض کے سلسلے کی سالانہ ادائیگی (سود + قرض) کل درآمدات کی آمدنی کا ۶۱ فی صد ہڑپ کر رہی ہے اور هَلْ مِنْ مَزِيد پکار رہی ہے۔

معیشت پر سب سے بڑا بوجھ قرض اور سود کی اس لعنت کا ہے جسے اس ملک کی سیکولر قیادت نے ترقی کا ضامن سمجھا تھا لیکن بالآخر اس کی معیشت ہی کو تباہ نہیں کیا بلکہ معاشی اور سیاسی آزادی اور پالیسی سازی کے اختیار تک کا سودا کر ڈالا اور ملک ایک ایسی دلدل میں دھنس گیا جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔

اب ذرا اس کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیجیے، جس سے عوام کی حالت اور ان کے مصائب کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

۱۹۶۰ کے عشرے میں ملک عزیز میں ایک کروڑ ۹۰ لاکھ افراد شدید غربت کا شکار تھے، یعنی اپنی کم سے کم ضروریات بھی پوری کرنے کے قابل نہ تھے اور ایک غیر انسانی (sub-human) زندگی گزار رہے تھے۔ نام نہاد ترقی کے بیس سال میں یعنی ۱۹۸۰ تک غربت کے ان ستم زدہ افراد کی تعداد بڑھ کر ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ ہو گئی۔ پھر بڑی حد تک بیرون ملک پاکستانیوں کی ترسیلات کی وجہ سے غربت کی سطح میں کمی آئی اور ۱۹۹۰ میں یہ تعداد ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی۔ لیکن ۱۹۹۰ کے بعد غربت میں پھر اضافہ شروع ہو گیا اور ۱۹۹۵ میں یہ تعداد بڑھ کر ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہو گئی ہے، یعنی صرف ۵ سال میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ کا اضافہ! یہی وجہ ہے کہ اس وقت ایک تہائی سے زیادہ آبادی شدید غربت کا شکار ہے۔ ۷۰ فی صد ناخواندہ ہیں اور ابتدائی تعلیم کی عمر والے بچوں کے صرف ۳۷ فی صد کو اسکولوں تک رسائی حاصل ہے۔ ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کو پینے کا صاف پانی اور ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ افراد کو حفظان صحت کی ابتدائی سہولتیں بھی حاصل نہیں۔ نومولود بچوں میں چار میں سے ایک اوسط وزن سے کم اور نشوونما کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے لیکن ہر پیدا ہونے والا بچہ اٹھارہ ہزار روپے کا مقروض

پیدا ہو رہا ہے۔

روتی ہے شبنم، کلی دل تنگ ہے، گل ہے سینہ چاک
کیا اسی مجموعۂ غم کا گلستاں نام ہے

تصویر کے یہ رخ تو آپ نے دیکھے--- اب ایک رخ اور بھی دیکھ لیجیے، اور وہ ہے نودولتیوں، بااثر سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں کا اور حکومت کے ارباب بست و کشاد کا۔ بظاہر ان پچاس سال میں ملکی پیداوار میں اوسطاً ۵ سے ۶ فی صد سالانہ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ کے عشرے میں یہ اضافہ ۸ فی صد، ۱۹۷۰ کے عشرے میں ۴.۸ فی صد، ۱۹۸۰ کے عشرے میں ۸.۵ فی صد اور ۱۹۹۰ کے سات سالوں میں ۴.۷ تھا جس کے نتیجے میں اعداد و شمار کی حد تک فی کس آمدنی میں گذشتہ ۲۰ سال میں ۲۲۱ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ اگر گھرانوں کے جائزے (Household Surveys) کی فراہم کردہ معلومات کا تجزیہ کیا جائے تو ۶۹-۱۹۶۸ میں اوسط گھرانے کی آمدنی شہری علاقے میں ۳۰۳ روپے اور دیہی علاقے میں ۱۹۷ روپے تھی جو اب ۹۳-۱۹۹۲ میں علی الترتیب ۴۹۷۶ اور ۳۰۷۰ روپے ہو گی۔ لیکن "اوسط" کے بارے میں اصل مشکل یہ ہے کہ وہ انفرادی سطح کے فرق کو چھپا لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غریب غریب تر ہوا ہے اور امیر امیر تر۔ ان جائزوں ہی سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ آبادی کے کم سے کم آمدنی والے ۲۰ فی صد افراد جن کا حصہ ۷۲-۱۹۷۱ کی کل قومی دولت میں ۸.۴ فی صد تھا، ۹۳-۱۹۹۲ میں کم ہو کر صرف ۶.۲ فی صد رہ گیا جبکہ امیر ترین ۲۰ فی صد جن کا حصہ ۷۲-۷۱ میں ۴۱.۵ فی صد تھا وہ بڑھ کر ۴۸.۲ فی صد ہو گیا (حکومت پاکستان کے شائع کردہ ۹۷-۱۹۹۶ کا Economic Survey کا صفحہ ۶)۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ملک کے تمام شیڈولڈ بنکوں میں دسمبر ۱۹۹۶ میں کل اکاؤنٹ دس لاکھ ۲۴ ہزار چار سو ۶۲ ہیں جس میں ۴۶۲,۴۱۵ ملین روپے ہیں۔ ان میں سے صرف ۶۶۵۶ افراد ایسے ہیں جن کے حساب میں ایک کروڑ یا اس سے زیادہ رقم تھی اور ان کے پاس کل ۲۶۹۰۰۴.۷ ملین روپے تھے یعنی کل ایڈوانسیز کا ۵۵ فی صد سے زیادہ۔ اور یہی وہ حسابات ہیں، یعنی ایک کروڑ یا دس لاکھ سے ایک کروڑ تک رقم والے، جن میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۹۵ کے مقابلے میں ۱۹۹۶ میں ان دونوں قسم کے حسابات میں ۲۲.۲ فی صد اور ۲۷.۲ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ صرف ایک ملین روپے سے زیادہ ایڈوانس والے حسابات میں کل بنک ایڈوانسیز کا ۸۹.۳ فی صد روپیہ ہے جن کی کل تعداد ۴۹۸۱۷ افراد ہوتی ہے، یعنی ۱۲ کروڑ کی آبادی میں نوے فی صد دولت تقریباً ۵۰ ہزار افراد کے پاس ہے۔

زراعت کے دائرے پر اگر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ ۶ ہزار بڑے زمینداروں کے پاس کل زرعی زمین کا ۴۰ فی صد ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کل زرعی آمدنی کا، جو ۶۰۰ بلین ہوتی ہے، ان ۶ ہزار

افراد کے پاس کتنا حصہ ہو گا اور آبادی کے ان ۷۲ فی صد کے پاس کتنا جو دیہی علاقوں میں رہتے اور زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کرتے ہیں۔ ملک کی معیشت اور سیاست پر یہی چند ہزار افراد چھائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ۸ ہزار افراد وہ ہیں جو بنکوں کے ۱۴۰ بلین روپے کے نادہندہ ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جو ٹیکس چوری کے مرتکب ہیں اور ملکی خزانے کو سالانہ کم از کم ۱۰۰ بلین روپے سے محروم رکھے ہوئے ہیں اور ہر احتساب سے بالا ہیں۔ انھی کے ہاتھوں میں وہ "سیاہ معیشت" (black economy) ہے جو حساب کتاب کے باہر ہے اور جس کا کم سے کم اندازہ ۵۰۰ بلین روپے ہے۔ سیاست کے ایوانوں پر بھی ان ہی کا قبضہ ہے اور انتظامیہ، پولیس اور احتساب کی ساری مشینری ان کی خدمت کے لیے کمربستہ ہے۔ ان کے طرز بود و باش کا کوئی تعلق عام شہری کی زندگی سے نہیں ہے۔ یہ اپنی ہی دنیا میں رہتے ہیں اور مفادات کے اشتراک کے سہارے بظاہر سارے اختلافات اور labels کے باوجود ایک قوم اور برادری بن گئے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جسے ہر سہولت حاصل ہے اور جو عملاً ہر طرح کی جواب دہی سے بالا ہے جبکہ عام انسان بے روزگاری اور تخفیف (down-sizing) کا شکار ہے اور مہنگائی کی چکی میں پس رہا ہے۔ ۱۹۶۰ کے عشرے میں کل لیبر فورس ۱۷.۲ ملین تھی اور کل بے روزگار ۲۵۰۰۰۰، یعنی لیبر فورس کا ۱.۵ فی صد۔ اب ۹۶-۱۹۹۵ میں کل لیبر فورس کا اندازہ ۳۶.۷ ملین ہے اور بے روزگار افراد کا اندازہ ۱۰.۷۸ ملین یعنی لیبر فورس کا ۴.۸۵ فی صد۔ اور یہ سرکاری اعداد و شمار ہیں۔ اصل بے روزگاری اور نیم بے روزگاری اس سے تین چار گنا زیادہ ہے۔

یہی معاملہ افراط زر اور مہنگائی کا ہے۔ صرف بنیادی ضرورت کی چند اشیا کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافے کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آج آٹا ۷ روپے کلو، چینی ۲۰ روپے کلو، بناسپتی گھی ۴۸ روپے کلو، دالیں ۲۵ سے ۴۰ روپے کلو، بکرے کا گوشت ۱۰۰ روپے اور گائے کا گوشت ۶۰ روپے کلو اور چائے ۱۷۵ روپے کلو ملتی ہے۔ جبکہ یہی اشیا چند سال قبل اس سے تہائی یا چوتھائی قیمت پر دستیاب تھیں۔ بجلی کے بلوں میں اضافہ ایک الگ کہانی ہے جس نے ہر گھر کا بجٹ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ قیمتوں میں ان مسلسل اضافوں سے عام آدمی کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے جبکہ: ع

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

ہم نے معیشت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ گذشتہ سال کی عمومی کیفیت کا اندازہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی سالانہ رپورٹ ۹۷-۱۹۹۶ (اکتوبر ۱۹۹۷) کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

"گذشتہ کئی سال سے پاکستان میں معاشی ترقی کی رفتار سست ہو گئی ہے۔ افراط زر مسلسل ۱۰ فی صد سے

زیادہ ہو رہا ہے جبکہ بیرونی ادائیگیوں کا توازن برابر کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کل قومی پیداوار میں اضافہ کی رفتار ۹۷-۱۹۹۶ میں ۱.۳ فی صد تھی جو آبادی میں اضافہ کی رفتار سے بس کچھ ہی زیادہ ہے جس کے معنی ہیں کہ فی کس آمدنی میں اوسطاً بھی کوئی بہتری کی نسبت پیدا نہیں ہوئی۔ بڑے پیمانے کی صنعت میں اضافے کے بجائے کمی کا رجحان ہے اور صنعتی پیداوار ۱.۴ فی صد کم ہو گئی ہے جبکہ زراعت میں اضافہ قدر (value added) کے اعتبار سے صرف ایک فی صد اضافہ ہوا ہے۔ بڑی بڑی زرعی فصلوں کی پیداوار میں تو درحقیقت ۴.۵ فی صد کی کمی ہوئی ہے۔ قومی بچت اور قومی سرمایہ کاری دونوں ہی میں کل قومی پیداوار کے تناسب کے اعتبار سے کمی ہوئی ہے۔ برآمدات میں ۲.۷ فی صد کی اور درآمدات میں ۰.۵ فی صد کی کمی ہوئی۔ ادائیگیوں کے توازن میں خسارہ رہا ہے جو قومی پیداوار کے ۶.۵ فی صد کے مساوی ہے۔ قومی بجٹ میں بھی خسارہ رہا ہے اور یہ خسارہ بھی قومی پیداوار کا ۶.۲ فی صد ہے۔ ٹیکس اور قومی پیداوار کے تناسب میں اضافہ کے بجائے کمی واقع ہوئی ہے۔ جبکہ کل قومی قرضے کا قومی پیداوار سے تناسب بڑھ گیا ہے۔ نتیجتاً نظام بنک کاری سے سرکاری قرضے اصل ہدف سے تین گنا زیادہ رہے ہیں۔ قرضوں میں بیش بہا اضافہ اور پیداوار میں ہدف سے کم اضافے کا نتیجہ افراط زر اور مہنگائی کی صورت میں نکلنا لازمی تھا اور یہی ہوا کہ ۹۷-۱۹۹۶ میں عام صرفی اشیا کے اشاریہ میں ۱۲ فی صد کے قریب اضافہ ہوا ہے"۔ (اسٹیٹ بنک رپورٹ، صفحہ ۲)

حکومت کی مایوس کن کارکردگی اور اس کی معاشی پالیسیوں کی ناکامی کے اعتراف کے لیے کیا کسی اور بیان یا ثبوت کی ضرورت ہے؟

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

ایک طرف یہ گھمبیر اور تشویش ناک صورت حال ہے اور دوسری طرف ارباب بست و کشاد کا یہ عالم ہے کہ اصل مسائل سے صرف نظر کر کے روز نت نئی لڑائیاں اور معرکے مول لے رہے ہیں۔ تین مہینے سے ملک کو شدید سیاسی اور عدالتی بحران سے دوچار کر رکھا ہے جس کے بارے میں وزیر خزانہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ۵ ارب روپے کا مزید نقصان ہوا ہے اور اگر وزیراعظم صاحب کے ارشاد پر اعتبار کیا جائے تو روزانہ ایک ارب روپے کا خسارہ واقع ہوا ہے۔ ان حالات میں بھی ارباب حکومت کی شاہ خرچیوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ چھوٹی کابینہ بنانے اور حکومت اور سرکاری اداروں میں تخفیف (downsizing) اور کفایت کے دعویداروں کا حال یہ ہے کہ صرف صدر مملکت اور وزیراعظم کے سرکاری دفاتر اور گھرانوں کے اخراجات دو ارب روپے سالانہ سے زیادہ ہیں۔ وزیراعظم کے لیے مغلیہ محلوں کے طرز پر نئے دفاتر کئی ارب روپے کے خرچ پر تیار کیے گئے ہیں اور مرکزی کابینہ کی تعداد اب ۲۷ وزرا، ۲۸ وزرائے مملکت اور ۲۴ مزید ایسے معاونین پر مشتمل ہے جن کا رتبہ وزیر کا ہے--- یعنی ۷۹ درجہ وزارت پر فائز حضرات---

اس ملک میں جس میں ۴ کروڑ سے زیادہ غریب ہیں اور جس کی کل سالانہ ملکی دولت فورڈ موٹر کمپنی کی سالانہ پیداوار سے کم ہے! نیز ملک کے سب سے غریب صوبے (بلوچستان) میں اسمبلی کے ۴۴ ممبران میں سے ۲۴ مسند وزارت پر متمکن ہیں۔

اور اس فوج ظفر موج کی معاملہ فہمی کا یہ حال ہے کہ ۱۲ دسمبر ۹۷ کے کابینہ کے اجلاس نے "اقتصادی صورت حال پر اطمینان کا اظہار کیا ہے" اور وزیر خزانہ نے نوید سنائی ہے کہ "ادائیگیوں کا توازن بہتر ہوا ہے اور برآمدات بڑھ رہی ہیں اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں"۔ راوی سب چین لکھتا ہے:

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

کیا فی الحقیقت ہمارے ارباب بست و کشاد یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں سب اندھے، بہرے اور گونگے بستے ہیں جن کو وہ جس طرح چاہیں اور جب تک چاہیں، دھوکے میں رکھ سکتے ہیں یا تاریخ انقلاب فرانس سے قبل کے کسی ویسے ہی منظر کا اعادہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس میں بھوک اور ظلم سے تنگ انسانوں کے انبوہ کثیر کی روٹی کی فریاد پر شاہ ہنری کی لڑکی نے کہا تھا: "پاپا، اگر ان کو روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھا لیتے"۔

اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب پانی سر سے اوپر ہو جائے اور حالات قابو سے نکل جائیں۔ معاش کی چوٹ تو ایسی چوٹ ہے جس سے اس قوم کے جسم کا پور پور دکھ رہا ہے اور ہر شخص درد کی تکلیف سے کراہ رہا ہے۔ اس کے لیے کسی خارجی خبر کی حاجت نہیں ہوتی۔

ہماری نگاہ میں بگاڑ کی اصل وجہ خدا سے بے خوفی اور عوام کی احتساب سے غفلت اور بے پروائی ہے۔ وسائل پر ایک مخصوص گروہ کا قبضہ ہے جو عوام سے کٹا ہوا ہے اور اپنی ہی دنیا میں مگن ہے۔ بظاہر الیکشن بھی ہیں اور جمہوریت کی مالا بھی جپی جا رہی ہے لیکن نہ قانون کی حکمرانی ہے اور نہ آزادی کے باوجود حقیقی اقتدار عوام کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اختیار و اقتدار اور وسائل سب بااختیار اشرافیہ (power elite) کے ایک منظم گروہ نے اغوا (hijack) کر لیے ہیں اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ محض پروپیگنڈے کی قوت پر مسلسل اپنی من مانی کرتے رہیں گے حالانکہ یہ تاریخ اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے۔ پریس کی آزادی، عدلیہ کی فعالیت اور سب سے بڑھ کر عوام کے اپنے حقوق کے لیے بیدار ہو جانے اور جدوجہد اور قربانی کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی صورت میں ظلم و استحصال کے اس نظام کے جاری رہنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے دن لازماً گنے جا چکے ہیں۔ البتہ تبدیلی کے دو ہی طریقے ہیں، یا ارباب اقتدار غرور اور

غفلت کے ظلم سے نکلیں اور خود کو بدلنے اور نظام کو بدلنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور اس طرح افہام و تفہیم اور قانون اور ضابطے کے ذریعے تبدیلی آئے۔ دوسری صورت میں ملک انقلاب کے دہانے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور جب انقلاب کی قوتیں ظلم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو پھر بڑی بڑی مضبوط کرسیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور بڑے بڑے مستحکم برج الٹ دیے جاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا--- یعنی بہ رضا و رغبت تبدیلی، یا ایسی تبدیلی جس میں سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ گویا انگریزی محاورے میں Change; or be Changed (تبدیل ہو جاؤ یا تبدیل کر دیے جاؤ گے)۔

معیشت کا بگاڑ جس مقام پر پہنچ گیا ہے وہاں جزوی اور نمایشی تبدیلیوں سے کوئی فرق واقع نہیں ہو گا۔ پچاس سال کی اندرونی کارکردگی اور نئے عالمی حالات اور تجربات دونوں بنیادی تبدیلیوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ آج تک ہماری معاشی پالیسیاں ارباب اقتدار اور بااثر طبقات کے مفاد اور بیرونی قوتوں کی خواہشات کے محور کے گرد گھومتی رہی ہیں۔ آج تک معاشی پالیسی سازی کا اسلوب وہی رہا ہے جو سامراجی دور میں قائم کیا گیا تھا۔ معاشی ترقی کے معنی پیداوار میں اضافہ اور دولت مند طبقات کو نت نئی سہولتیں فراہم کرنا سمجھ لیا گیا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سرد جنگ کے پس منظر میں امریکہ اور یورپی اقوام نے اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے عالمی نظام کا جو نقشہ بنایا، ہماری قیادتیں اس کا حصہ بن گئیں اور پھر بیرونی امداد، سرمایہ کاری اور عالمی بنک اور آئی ایم ایف کی حکمت عملی کی اسیر ہو گئیں۔ اس کے نتیجے میں ہماری معاشی پالیسیوں کا کوئی رشتہ اور تعلق نظریہ پاکستان اور عوام کے دینی، اخلاقی، نظریاتی اور سماجی احساسات اور اقدار سے نہ جڑ سکا، معاشی میدان میں مادی فکر غالب رہی۔ پہلے سرمایہ دارانہ نظام کی خوشہ چینی کو منزل بنایا، پھر سوشلزم اور قومی ملکیت کی حاشیہ گیری کا راستہ اختیار کیا اور اب پھر آزاد معیشت، منڈی کی معیشت، آزاد روی (Liberalisation) اور عالمگیریت (Globalisation) کے راگ میں راگ ملایا جا رہا ہے، بلالحاظ اس بات کے کہ اس قوم کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ اس کے تاریخی عزائم کیا ہیں؟ اس کا حقیقی مفاد کن چیزوں میں مضمر ہے؟ اور اس کے عوام کی فلاح و بہبود کا حصول کس طرح ممکن ہے؟ ملک اور عوام کا مفاد، انصاف اور معاشرتی فلاح و بہبود کا حصول، پیداوار میں اضافہ کے ساتھ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل اجتماعی کا قیام--- یہ چیزیں ہماری معاشی پالیسی اور منصوبہ بندی کا ہدف کبھی بھی نہیں رہیں اور یہی وجہ ہے کہ معاشی پالیسی صرف مفاد پرست طبقات کا آلہ کار بنی رہی۔ وقت آگیا ہے کہ اس بت کو پاش پاش کر دیا جائے اور معاشی پالیسی اور منصوبہ بندی کے نظام میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کی جائیں تاکہ اس ملک کے معاشی وسائل اس ملک کے عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال ہو سکیں۔ اس کے لیے بالکل ایک نئے ذہن اور نئے زاویہ نظر کی ضرورت ہے۔ مغرب کے فراہم کردہ نمونوں (models) سے نجات اور اپنی اقدار

اور اپنے اصولوں کی روشنی میں واضح اہداف اور پالیسیوں کا تعین ضروری ہے۔ محض معاشی ترقی کے خدا کی پوجا نے معیشت ہی نہیں، معاش کی سیڑھی پر چڑھنے والے ہر فرد کو دنیا پرستی، اور مفاد پرستی کا شکار کر لیا ہے۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد، انسانوں کے حقوق کا احترام، اپنے ساتھ دوسروں کی فلاح کا مساوی اہتمام--- ان میں سے کوئی چیز بھی ہماری معاشی زندگی کا حصہ نہیں بن سکی۔

مشہور مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے چھبیس تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر انسان محض دنیاوی مقاصد اور مادی خوشی کے لیے اپنی ساری تگ و دو کرے تو ساری سرگردانی کے باوجود بھی حقیقی مسرت حاصل نہیں ہو پاتی۔ البتہ اگر کوئی اعلیٰ مقصد پیش نظر ہو، جیسے بدی کے مقابلے میں سچائی اور حق کی تائید، اور حقیقت مطلق یعنی خدا اور اس کی مرضی سے ہم آہنگی، تو اس کے ضمنی نتیجے کے طور پر دنیوی اور مادی خوشی اور اطمینان بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ (Arnold Toynbee, Christianity among the Relegions of the World، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، لندن، ۱۹۵۸، ص ۵۶)

روزنامہ **انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹربیون** کا مشہور کالم نگار ولیم پفاف (William Pfaff) حالیہ ایشیائی مالیاتی بحران کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ نظام، منڈی کی معیشت اور عالمگیریت کا دلچسپ تجزیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر سوسائٹی اور ہر کلچر کا اپنا مزاج اور اہداف ہوتے ہیں اور محض ایک عالمگیر نظام کے نام پر ان تمام اقدار کو نظرانداز کر دینا سخت مہلک ہو سکتا ہے۔ ولیم پفاف دولت کے اخلاقی مطالبات اور مقتضیات کے احیا کی ضرورت کا احساس دلاتا اور لکھتا ہے:

"دولت کی اخلاقی ذمہ داریوں کا تصور ۱۹۵۰ کے عشرے تک موجود تھا اور اس کا اظہار اجتماعی شہریت (Corporate Citizenship) کے تصور میں ہوا۔ یعنی یہ تصور کہ تجارتی کمپنیوں کی ذمہ داری ان تمام عناصر کے بارے میں ہے جو کاروبار سے کسی بھی وجہ سے وابستہ ہیں یعنی stake holder ہیں، مثلاً مزدور اور معاشرہ بھی اسی طرح اہم ہیں جس طرح کمپنی کے حصہ دار۔ آج کے امریکی سرمایہ دارانہ نظام میں stake holder کا تصور معدوم ہو گیا ہے اور اب سب کچھ صرف share holder اور مینیجر کے فائدے کے لیے ہے۔ اجتماعی اخلاق اور صنعت و تجارت کا دیرینہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ ریاست اور چرچ کی علیحدگی کے نام پر مذہبی اثرات کو غیر موثر کر دیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عوام اور اشراف (elite) سب ہی ذاتی مفاد کے اسیر ہو گئے ہیں"۔ (ڈان، ۱۰ دسمبر ۱۹۹۷ بحوالہ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون)

دولت پرستی اور نفسا نفسی کی جو آگ امریکہ اور یورپ میں لگی ہوئی ہے اور جسے سرمایہ داری نے ایک معتبر چیز بنا دیا ہے، پاکستان کا مقتدر طبقہ بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ اس رویے اور دولت پرستی کے اس کلچر کا خاتمہ اور اس کی جگہ معیشت اور اخلاق اور دولت اور انصاف کے اس رشتے کو بحال کرنے کی

ضرورت ہے جو اسلام اور تمام الہامی مذاہب کا خاصہ رہا ہے اور جن میں دولت کو ایک امانت تصور کیا جاتا ہے، جس کا حصول تو مطلوب ہے لیکن اس کا حصول اور صرف، دونوں حلال صورتوں میں عدل اجتماعی اور تمام انسانوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے لیے اجتماعی فلاح و خوشحالی کے لیے ہے۔ یہی چیز دولت اور معاشی ترقی کو خیر، صلاح و فلاح کی قوت بناتی ہے اور انسانی معاشرے کو ظلم و استحصال سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہماری معاشی پالیسی کو ہی سب سے پہلے اس نئے آہنگ (orientation) کی ضرورت ہے۔

دوسری بنیادی چیز خود انحصاری اور بیرونی امداد اور بیرونی سرمایے پر ویسی محتاجی سے بچنا ہے جو ایک طرف ہماری سیاسی اور معاشی آزادی کو متاثر کرے اور دوسری طرف ملک کو صرف بیرونی سرمایے اور بیرونی مصنوعات کی منڈی بنا دے اور یہاں حقیقی پیدا آوری عمل مستحکم نہ ہو سکے۔

مغربی اقوام نے سود کی بنیاد پر عالمی سرمایہ کاری اور ساہوکاری کا جو نظام قائم کیا ہے وہ اجتماعی ظلم کی بدترین مثال ہے۔ اس نظام کے ذریعے پوری دنیا کی معیشت کو چند عالمی ساہوکاروں کی گرفت میں دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ عالمگیریت اور منڈی کی معیشت اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ہم نے چالیس سال کے تلخ تجربے کے ذریعے بچشم سر دیکھ لیا ہے کہ اس سودی سرمایہ داری کے ذریعے کوئی حقیقی ترقی ممکن نہیں اور بالاخر یہ سرمایہ اور بیرونی امداد ایسی آکاس بیل بن جاتی ہے جو نمو کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے اور سرسبز و شاداب درخت جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔

جس وقت پاکستان میں معاشی ترقی کے نام پر کچھ ہمارے اپنے سیاست دان اور معاشی ماہرین امریکہ اور یورپ کے معاشی ماہرین، منصوبہ سازوں اور بنک کاروں کے تعاون سے بیرونی امداد اور عالمی سرمایہ کاری کا یہ ڈھول بجا رہے تھے اور ہمیں اس جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں، کچھ بالغ نظر رہنماؤں نے خود کشی کے اس راستے سے قوم کو روکنے کی کوشش کی، لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ آج ان کے الفاظ پر ایک بار پھر گہرے غور و خوض کی ضرورت ہے تاکہ نئی حکمت عملی پرانی غلطیوں سے پاک ہو سکے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت اسلامی پاکستان کے کل پاکستان اجتماع عام (نومبر ۱۹۵۱ کراچی) میں ہوا کا رخ دیکھ کر متنبہ کیا تھا کہ:

"ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے جو کچھ کیا اور سوچا جا رہا ہے اس میں ہم کو دو بہت بڑی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان ساری تجویزوں میں زیادہ تر بیرونی سرمایے پر اعتماد کیا جا رہا ہے اور اس کو یہاں آنے کی دعوت دی جا رہی ہے، حالانکہ بیرونی سرمایے سے ایک ملک کی اپنی تعمیر و ترقی میں جتنی مدد ملتی ہے اس سے بہت زیادہ سیاسی اور معاشی نقصان پہنچتا ہے۔ مجھے کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کوئی ملک اس بلا کو دعوت دینے کے بعد سیاسی مغلوبی میں مبتلا ہونے اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا تختہ مشق بننے

سے بچ گیا ہو۔ اور میرے علم میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہمارے منتظمین ریاست کے پاس کوئی تعویذ ایسا موجود ہے جسے گلے میں باندھ دینے سے یہ بلا ہمیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

دوسری غلطی، جو اس معاملے میں ہم دیکھ رہے ہیں، یہ ہے، کہ ذرائع کا بہت بڑا حصہ حقیقی تعمیر و ترقی کے کاموں پر صرف ہونے کے بجائے ایسے کاموں پر صرف ہو رہا ہے جن سے پاکستان اپنی ظاہری شان و شوکت کے اعتبار سے دولت مند ملکوں کے شانہ بشانہ رکھا جا سکے اور جسے دیکھ کر گھر کے ظاہر پرست اور باہر کے سطح بین لوگ اس ملک کے سربراہ کاروں کو داد دینے لگیں کہ انھوں نے واقعی اپنے ملک کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا بٹھایا ہے"۔ (ہمارے داخلی اور خارجی مسائل، از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامک پبلیکیشنز، ص ۲۸-۲۹)

پھر ۱۹۵۷ میں ایک انٹرویو میں مولانا مودودی نے بنیادی صنعتوں، خصوصیت سے فولادی صنعت کے قیام اور فروغ کی اپیل کی اور متنبہ کیا کہ مغربی میڈیا ہمیں گمراہ کر رہا ہے اور ہمیں سوچ سمجھ کر اپنی ترجیحات طے کرنی چاہییں۔ مولانا مودودیؒ نے کہا:

"موجودہ ترقی کی حالت یہ ہے کہ بعض بنیادی صنعتوں کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ مثال کے طور پر لوہے اور فولاد کی بنیادی صنعت کے قیام میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں، حالانکہ جدید زراعت کے لیے بھی فولاد کی صنعت ضروری ہے۔ فولاد کی صنعت کے راستے میں جس طرح رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے اس کے اصل مقاصد اور باطنی اسباب طشت از بام ہو چکے ہیں اور یہ کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں"۔ (روزنامہ تسنیم، ۱۴ اگست ۱۹۵۷)

اور پھر ایوب کے دور حکومت میں ۱۹۶۲ میں مولانا نے فرمایا:

"اب تک یہ ہوتا آ رہا ہے کہ غیر ملکی امداد پر سب سے زیادہ اعتماد کیا گیا اور یہ امداد بھی گر پڑ کر حاصل کی گئی جس سے ہمارے حلیفوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ہم ان کے دست نگر اور پروردہ ہیں۔ اس غلطی کے نتائج کھل کر سامنے آ گئے ہیں اور اگر ہم نے اب بھی تلافی نہیں کی تو ہمیں اس کا تباہ کن خمیازہ بھگتنا ہو گا"۔ (ہفت روزہ ایشیا، ۲۹ نومبر ۱۹۶۲)

اسی طرح سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی نے اپنے ایک مضمون "غیر ملکی قرضے، دور رس مضمرات" میں قوم کو صاف الفاظ میں متنبہ کیا تھا:

"ان قرضوں کے تحت معاشی خوشحالی کا جو عارضی احساس پیدا ہوا ہے وہ اصل میں اس شاہ خرچ زمیندار کی حالت کے مترادف ہے جو اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلا کر ادھار لی ہوئی رقم سے عیش کرتا ہے، جب قرض لی ہوئی ایک رقم صرف ہو جاتی ہے تو وہ دوسری کے لیے ہاتھ دراز کرتا ہے، تا آنکہ وہ مکمل طور پر مہاجن کے پنجے میں جکڑا جاتا ہے"۔

ان قرضوں کی شرائط کے بارے میں انھوں نے لکھا:

"غیر ملکی قرضوں کی ایک شرط بالعموم یہ ہوتی ہے کہ قرضے کی رقم سے خریدا جانے والا سامان رقم دینے والے ملک سے ہی خریدا جائے اور قرض دینے والے عظیم ترین ملک امریکہ میں اشیا کی قیمتیں عالمی قیمتوں کے مقابلے میں اوسطاً ۳۵ سے ۴۰ فی صد تک زیادہ ہوتی ہیں۔ اس طرح ہم دس لاکھ ڈالر کے غیر ملکی قرضے پر عملاً محض چھ ساڑھے چھ لاکھ ڈالر کی اشیا حاصل کرتے ہیں، اس کے علاوہ ماہروں، مشیروں کی فیس دینی ہوتی ہے اور قرض دینے والے ملکوں کے جہاز سامان کی ترسیل کے لیے حاصل کرنے ہوتے ہیں"۔

قرضوں کے استعمال کے بارے میں چودھری محمد علی نے لکھا تھا:

"ان خطیر قرضوں کو ایسی اہم مشینری اور دوسرے بھاری سازوسامان کے حصول کے سلسلہ میں بروئے کار نہیں لایا گیا جن سے ملک میں پیداواری صلاحیت بھی بڑھتی اور غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی بھی ممکن ہوتی بلکہ ان کا بیشتر حصہ روز مرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے صرف ہوا"۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

"۷۰-۱۹۶۹ کے بعد اگر پاکستان مزید قرضے نہ لے تو بھی سابقہ قرضوں کی واپسی اکیسویں صدی تک جاری رہے گی ہم پرانے قرضوں کو نمٹانے کے لیے نئے قرض لینے پر مجبور ہوں گے اور سود در سود کی وجہ سے قومی معیشت متزلزل ہو گی"۔

غیر ملکی قرضوں کے سیاسی مضمرات پر تبصرہ کرتے ہوئے چودھری محمد علی مرحوم نے لکھا:

"جب ایک قوم معاشی طور پر دیوالیہ پن کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے تو قرض دینے والوں کی طرف سے اس کو فکر و عمل کی آزادی سے محروم کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہے۔ قومی معاملات پر خارجی طاقتوں کا بتدریج اثر مقتدر افراد کے اخراج و تقرر کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان طاقتوں کا دباؤ عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو لیکن اس کا ہولناک سلسلہ جاری رہتا ہے خاص کر اس وقت جب نئے قرضوں کی ضرورت درپیش ہوتی ہے"۔

کئی اور اہل علم نے اپنے اپنے انداز میں بیرونی امداد اور غیر ملکی قرضوں کے بارے میں نیز بنیادی صنعت اور زراعت میں خود انحصاری کی اہمیت کو واضح کیا تھا۔ آج ۴۰ سال کے بعد وہ سارے تباہ کن اثرات جن سے متنبہ کیا تھا، ہم بچشم سر دیکھ سکتے ہیں لیکن ارباب اقتدار ہیں کہ ابھی تک ان کی آنکھیں نہیں کھلیں۔

حال ہی میں ورلڈ بنک کے سابق نائب صدر سید شاہد حسن کا بھی ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جو اگر ایک طرف گھر کے بھیدی کی گواہی کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف خود ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی پچاس سالہ کارکردگی پر بھرپور طنز ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

"میں نے کبھی کسی ایسے معاشی نظام کو پنپتے نہیں دیکھا، جہاں حکومت جاری اخراجات پورے کرنے کے لیے بیرونی قرضوں، بالخصوص قلیل مدت قرضوں پر لامحدود انحصار کرتی ہو۔ پاکستان کی موجودہ حکومتوں کی ترجیحات میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو قیمتی اور قلیل بیرونی فنڈ پر انحصار کم کرے۔ پاکستان کا بیرونی امداد پر انحصار بڑھتا ہی جا رہا ہے جبکہ اخراجات میں کمی لازماً ہونا چاہیے۔ مجھے محاصل سے آمدنی میں غیر معمولی اضافے کے بغیر، پاکستان کے معاشی مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ (ترجمہ)

(فرائیڈے ٹائمز، ۱۷ تا ۲۳ اکتوبر ۹۷، ص ۲۴)

لیکن حکومت ہے کہ قرض پر قرض لیے جا رہی ہے اور قرض میں ہر نئی قسط کو اپنی پالیسیوں کی کامیابی کے سند کے طور پر پیش کر رہی ہے اور اس سے مکمل صرف نظر کیے ہوئے ہے کہ اس "فاقہ مستی" کے کتنے تباہ کن اثرات ملک کے لیے خصوصیت سے کم آمدنی والے افراد کے لیے رونما ہو رہے ہیں۔

معاشی منصوبہ بندی کے اس ناکام تجربے پر کھلی بحث وقت کی اہم ضرورت ہے۔ حال ہی میں جو کچھ مشرقی ایشیا کے ممالک میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس کی حیثیت بھی ایک تازیانہ عبرت سے کم نہیں۔ چھوٹے ممالک کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ اپنی موثر معاشی حصار بندی کریں، انفرادی اور اجتماعی خود انحصاری کا راستہ اختیار کریں، اپنے وسائل کا صحیح صحیح استعمال کریں، بیرونی امداد اور سرمایہ کاری کے اثرات اور تقاضوں کا دقت نظر سے جائزہ لیں اور اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں۔ کفایت شعاری کو اختیار کریں اور معاشی ترقی کا وہ اسلوب اختیار کریں جس کے نتیجے میں وسائل کو بہترین ٹیکنالوجی کی مدد سے ترقی دی جا سکے، دولت کی منصفانہ تقسیم ہو اور ملک کے تمام افراد اور حصوں میں خوشحالی، ضروریات زندگی اور وسائل ترقی کی فراوانی ممکن ہو سکے۔ ترقی کے اس اسلوب کے ذریعے معاشی، معاشرتی اور سیاسی آزادی کا دفاع اور استحکام بھی ہو سکتا ہے اور روح اور جسم دونوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔

اقبال نے جن اقدار کی تعلیم ہمیں دی تھی وہ وہی ہیں جو خود اسلام کی بہترین روایات ہیں اور ان کے ذریعے دولت اور عزت دونوں حاصل ہو سکتے ہیں ۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی نیز۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن، جاتا ہے دھن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن